انوار الحق سہمی ایم اے، ایل ایل بی۔ ایم ای ڈی

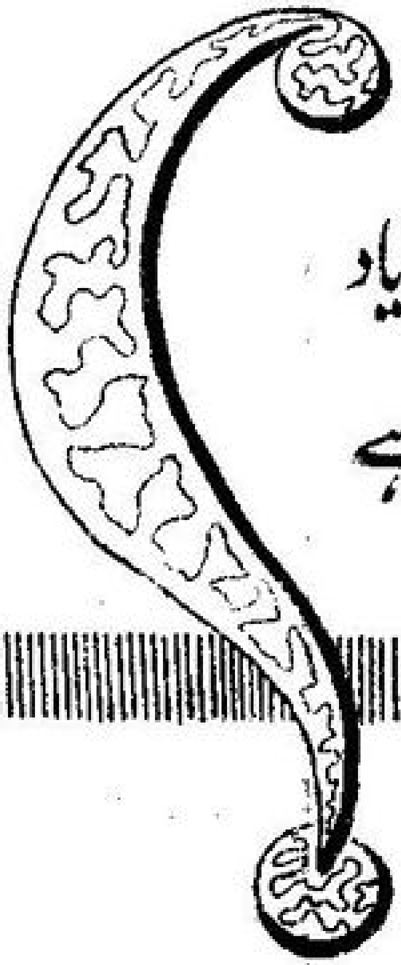

کیا اسلامی سوشلزم کی بنیاد قرآن کا فلسفۂ حیات ہے

پہلی قسط

حیرت اور دکھ کی بات ہے کہ علمی بحثیں بھی اکثر غیر علمی رنگ اور تعصب کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت میرے سامنے ڈاکٹر شوکت سبزواری کا وہ مختصر مضمون ہے جو ۱۰ فروری ۱۹۶۹ء کے "جنگ" میں چھپا تھا۔ عنوان تھا "اسلامی سوشلزم کی بنیاد قرآن کا فلسفۂ حیات ہے"۔ امید تھی کہ اس دو ٹوک اور جارحانہ عنوان کے تحت موصوف نے تحقیق کا حق ادا کیا ہوگا؛ اور صحیح فکر کے ٹھیک ٹھیک نتائج پیش کئے ہوں گے، لیکن مضمون جیسے جیسے نظر سے گزرتا گیا مایوسی تاریک تر ہوتی چلی گئی، مقدمات غلط، نتائج ٹیڑھے، استدلال کمزور، اور حد یہ ہے کہ قرآن کی ایک آیت کی تشریح بالکل اُلٹ!

نکتہ بہ نکتہ چلیئے، شروع میں کہتے ہیں: "سوشلزم میں کسی ایسی ترمیم کے بھی یہ حضرات روادار نہیں جو کسی اسلامی اصول کی روشنی میں اسلام سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کی جائے۔"

سوال یہ ہے کہ آخر یہ لوگ سوشلزم کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بے چین کیوں ہیں۔؟ کیا اس مصالحت (COMPROMISE) کی ضرورت اسلام کو پیش آئی ہے یا سوشلزم کو۔؟ کیا اس پیوندسازی کی تڑپ یورپ کے اُن ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے، جہاں سوشلزم نے جنم لیا ہے اور جو اُسی کے گہوارہ ہیں یا جدت کی یہ ترنگ محض اُسی سرزمین سے اٹھی ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت رہتی ہے۔؟ ظاہر ہے کہ کسی سوشلسٹ معاشرے میں اس تجربہ کاری کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے جسے "سوشلزم کو اسلام سے ہم آہنگ" کرنے کا نام دیا جا رہا ہے۔ پھر وہ "اسلامی اصول" ہے کونسا جس کی روشنی میں اس "ہم آہنگی" کی پلاسٹک سرجری کا یہ کارنامہ سرانجام دیا جائے گا۔ قرآن تو نصِ قطعی کے ذریعہ یہ اعلان کر چکا کہ نوعِ انسانی کے لئے دین (ضابطۂ حیات) مکمل ہو چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی صرف اور صرف اسلام ہی کو حاصل ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔ "آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا ہے، اور تم پر اپنی نعمت کو تمام کر دیا ہے اور تمہارے اسلام کو بطور دین اختیار کرنے پر راضی ہوں۔" (المائدہ، رکوع ۱، آیت ۳)

پس صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف اسلام پوری زندگی کے لئے جامع اور مکمل نظام ہونے کا داعی ہے تو دوسری طرف سوشلزم کا دعویٰ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے، ایک طرف اہلِ اسلام کسی پیوندسازی کو گوارا نہیں کر سکتے تو دوسری طرف سوشلزم کے پیرو اس بات کے روادار نہیں ہو سکتے کہ کسی دوسرے نظام سے مصالحت کا کوئی فارمولا تسلیم کر لیا جائے، جو شخص یہ یقین و احساس رکھتا ہو کہ اسلام میں کچھ کمی ہے، اور اس کمی کو پورا کر کے وہ انسانی تاریخ پر کوئی احسان کر ڈالے گا، اگر اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند لگا دے، وہ اگر خود فریبی میں مبتلا نہیں تو ایک نہایت ہی سنگین فریب دہی کا مرتکب ضرور ہے۔ جب "سرمایہ دارانہ سوشلزم" جیسی کوئی چیز نہیں ہو سکتی تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ "اسلامی سوشلزم" یا "اسلامی سرمایہ داری" کے عجیب و غریب تصور کی پرورش کی جائے۔؟

ڈاکٹر موصوف آگے لکھتے ہیں "سوشلزم اُنیسویں صدی عیسوی کی دوسری چوتھائی کی پیداوار ہے۔ اس لئے اسلام سے اسکی مخالفت کے یہ معنی تو ہو نہیں سکتے کہ کتاب یعنی قرآن نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ حدیث میں اسے ممنوع ٹھہرایا گیا ہے۔ سوشلزم کا جب وجود ہی نہ تھا تو اُسے ناجائز یا ممنوع کس طرح ٹھہرایا جاتا۔ فکری تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ سوشلزم انیسویں صدی

عیسوی کی دوسری چوتھائی کی پیداوار نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پرودھن، مارکس و اینلجز اور پرنس کروپوٹکن یہ سب انیسوی صدی کے لوگ تھے، اور انہوں نے سوشلزم کے تین مختلف برانڈ (بشمول مارکس و اینلجز کے ایک برانڈ) پیش کئے۔ لیکن سوشلزم کے ایک برانڈ کا خالق افلاطون تھا جس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "جمہوریت" میں حکمران گروہ کے لئے سوشلزم کا وہ مثالی نمونہ پیش کیا ہے جس میں اجتماعی ملکیت اتنی مکمل ہے کہ اس سے بڑھ کر مکمل ہو نہیں سکتی، وہاں تمام پیداواری وسائل و ذرائع حتیٰ کہ بیویاں تک سب کی مشترک اور اجتماعی ہیں۔

اسلام سے ماقبل ایک زمانے میں ایران کی مزدکیت بھی سوشلزم ہی کی ایک قسم تھی۔ پھر ٹامس مور (۱۴۷۸ء تا ۱۵۳۵ء) نے اپنے "یوٹوپیا" میں سوشلزم ہی کا راگ الاپا تھا۔ خود مارکس کے پیرو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مارکس نے آکر "سائنٹفک سوشلزم" پیش کیا، جبکہ اس سے پہلے کے مفکرین محض شاعرانہ سوشلزم (UTOPIAN SOCIALISM) پیش کرتے رہے۔

تاریخ سے آنکھیں بند کر کے اگر ڈاکٹر سبزواری کی یہ انوکھی تحقیق صحیح مان بھی لی جائے کہ سوشلزم انیسویں صدی عیسوی کی دوسری چوتھائی کی پیداوار ہے، اور اس سے پہلے کسی قسم کے سوشلزم کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا تو کیا فی نفسہٖ یہ ایک دلیل بن جائے گی کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سوشلزم پیدا ہوا، لہٰذا قرآن و حدیث سوشلزم کے مخالف ہو ہی نہیں سکتے۔؟ اس "دلیل" کے بین السطور سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس گروہ کی ناکام وکالت کر رہے ہیں جس کے نزدیک نعوذ باللہ نہ تو قرآن خدا کی کتاب ہے، اور نہ آنحضورؐ خدا کے رسول تھے، ورنہ یہ تصور کس طرح ممکن ہے کہ قرآن و حدیث اپنے سے پیشتر اور ہمعصر جاہلیت کے خلاف تو ہدایت کا سرچشمہ تھے۔ لیکن مستقبل کی کسی جاہلیت کی کاٹ ان میں نہیں ملتی۔؟ پھر کیا دنیا کو یہ بتانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ چونکہ قرآن و حدیث میں سوشلزم کا نام لیکر اس کی مخالفت نہیں کی گئی لہٰذا سوشلزم جائز ٹھہرا، اور یہ کہ ایک عمدہ "اسلامی سوشلزم" بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔؟

سوشلزم کا مقابلہ موجودہ نظام سے کرتے ہوئے ڈاکٹر سبزواری لکھتے ہیں۔ "موجودہ نظامِ معاش جسے اسلامی بتایا جاتا ہے، انفرادی ہے۔" ان لوگوں کی ہمت کی داد دینا چاہیئے کہ دن کی صاف روشنی میں اتنا بڑا بہتان بے جھجک گھڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ کوئی صحیح الدماغ شخص موجودہ نظامِ معاش کو اسلامی نہیں کہہ سکتا، کسے خبر نہیں کہ موجودہ نظامِ معاش برطانوی سامراج کا ورثہ ہے۔ اور اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسان کے صحت مند ارتقاء، تکمیل خودی اور حصول عظمت

کے راستے میں دراصل سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں سنگ گراں ہیں۔ دونوں ام الخبائث مادیت کی پیداوار ہیں۔ دونوں انسان کے خودساختہ، یک رُخے اور غیر متوازن ہیں۔ اسلام کے نزدیک دونوں جاہلیت کے نمونے ہیں۔ اقبالؒ بھی دونوں کی ہلاکت آفرینی اور انسانیت کشی کا ماتم کناں ہے ——

هر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — هر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج — درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست — آں برد جاں را زتن ناں را زدست
غرق دیدم هر دو را درآب و گل — هر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن باساختن
درگلے تخم دلے انداختن

غربیاں گم کردہ اند افلاک را — درشکم جویند جان پاک را
رنگ و بو ازتن نگیرد جان پاک — جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دین آں پیغمبرِ حق ناشناس — برمساواتِ شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ درآب و گل است (جاوید نامہ)

ڈاکٹر سبزواری آگے چل کر لکھتے ہیں: "روزی میں مسابقت تمام اخلاقی اور سماجی مفاسد کی جڑ ہے"۔ یہ جھاڑو پھیر دینے والا کلیہ بنا کر رکھ دینا قطعی غلط ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اخلاقی اور سماجی مفاسد کے مختلف اسباب میں سے بے قید مادّی مسابقت ایک سبب ہے گہری نظر سے دیکھیے تو یہ خرابی سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں میں پائی جاتی ہے۔ فرق محض یہ ہے کہ سرمایہ داری میں یہ انفرادی سطح پر پائی جاتی ہے، اور سوشلزم میں اس کا وجود زیادہ تر اجتماعی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اندر کے لئے سوشلسٹ معاشرے میں یہ خرابی اتنی نمایاں نہیں ہوتی جتنی سرمایہ دارانہ نظام میں، لیکن باہر کے لیے اس کا وجود سوشلسٹ معاشرے میں سرمایہ داری کی نسبت کسی طرح کم مفاد پرست نہیں ہوتا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مشرقی یورپ کے چھوٹے ملکوں کی تاریخ پر نظر ڈال لیجئے، حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی، ہر موقع پر تاریخ سے آنکھیں بند کر لینے کی اگر مصلحت پرست عادت ہی پڑ چکی ہو تو بات دوسری ہے، ورنہ سرخ سامراج اور سفید سامراج

میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

تمام اخلاقی اور سماجی مفاسد کی اصلی جڑ انسان کی یہ فکر و کوشش ہے کہ وہ خدا کی ہدایت سے ہٹ کر کوئی نہ کوئی "ازم" وضع کر کے اور اس پر نظام زندگی چلائے۔ نیز خدا سے حصولِ ہدایت کا یہ طریقہ کبھی سودمند نہیں رہا کہ آدھے پونے پر سودا بازی کی جائے۔ یہ بات کہیں اور چل سکتی ہو تو چل سکتی ہو کہ خدا کا خدا کے حوالے اور سیزر کا سیزر کے حوالے، لیکن اسلام میں اس مذاق کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ "اسلام ہمارا دین" تو ہے لیکن طرزِ حکومت کے لئے ہمیں مغرب سے جمہوریت کی بھیک مانگنی ہوگی، اور معیشت میں ہدایت کے لئے سوشلزم کے سامنے جبینِ نیاز جھکانی پڑے گی تو بتایئے کہ کیا اسلام صرف مسجد کی چار دیواری میں بند ہونے کے لئے ہے اور کیا اس کے مکمل ہونے کا دعویٰ جھوٹا ہے۔؟

ہر نظام اپنے جداگانہ اصول، اپنا علیحدہ نصب العین، اپنا الگ پروگرام، اپنا ممتاز طریقِ کار، اپنا منفرد مزاج اور اپنی مخصوص اصطلاحات رکھتا ہے۔ جب انسان کے خود ساختہ نظاموں کا یہ حال ہے تو کیا یہ تقدیر صرف اسلام ہی کے حصہ میں آئی ہے کہ خدا کا آخری اور مکمل ترین ہدایت نامہ ہونے کے باوجود وہ کبھی مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے سامنے جھولی پھیلائے، کبھی ہٹلر کے نازی ازم و مسولینی کے فاشزم کے آگے دستِ سوال دراز کرے، اور کبھی کارل مارکس کی پرولتاری آمریت و جدلی مادیت کے حضور اپنا کشکولِ گدائی پیش کرتا پھرے کہ اس میں اصول، نصب العین، طریقِ کار اور اصطلاحات کی بھیک ڈال دی جائے۔؟ —

سچ ہے کہ ؎

غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

ظاہر ہے غلامی محض اجسام کی غلامی نہیں ہوتی بلکہ غلامی کی اصل جڑ وہ ہے جو اذہان و قلوب میں پیوست ہوتی ہے۔ یہ جڑ اتنی غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتی ہے کہ خود وہ افراد اور گروہ جن کے اندر یہ پائی جاتی ہے، اس کا کوئی شعور نہیں رکھتے بلکہ اس ایک مرض کی بدولت بے شمار دوسری نفسیاتی، اخلاقی اور روحانی بیماریوں کی یلغار کے درمیان وہ لوگ اس گھمنڈ میں مگن رہتے ہیں کہ "روشن خیالی" اور "ترقی پسندی" کے واحد اجارہ دار وہی ہیں اور باقی سب "رجعت پسندی" کی گالی کے مستحق ہیں۔

(دوسری قسط اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں)